IQBAL REVIEW (66: 3)
(July – September 2025)
ISSN(p): 0021-0773
ISSN(e): 3006-9130

گلشن راز جدید۔ اقبال کا تصور تصوف اور فلسفہ خودی

Gulshan-e-Raz-e-Jadeed: Iqbal's Vision of Tasawuf and the Philosophy of the Self

عابدہ مبشر
پی ایچ ڈی سکالر
شعبہ اقبالیات،
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

ABSTRACT

The *Masnavi Gulshan-i-Raz Jadid* is a masterpiece of Allama Iqbal's Persian poetry, included in his collection *Zabur-i-'Ajam*. This Masnavi was written as a response to the renowned work *Gulshan-i-Raz* by Shaykh Mahmud Shabistari, composed seven centuries earlier. While adopting most of Shabistari's questions, Iqbal provided answers in the light of the intellectual and cultural conditions of his own era, as well as the guidance of the Qur'an and Sunnah. Whereas Shabistari, within the framework of the philosophy of *wahdat al-wujud* (unity of being), regarded annihilation in God (*fana fi Allah*) as the pinnacle of human perfection, Iqbal considered the

affirmation and perfection of the *self* (*khudi*) to be the true summit of life. The background to the creation of this Masnavi, in Iqbal's view, lay in diagnosing the intellectual and spiritual decline of the Muslim Ummah and offering its remedy. He reinterpreted the ancient Sufi terminology to suit the needs of the modern age and presented an intellectual and spiritual manifesto against the Western colonial challenge (*fitnah-i-Farang*). Consisting of 326 verses, this Masnavi forms a vital link in Iqbal's intellectual evolution—from *Asrar-i-Khudi* through to *Javid Nama* and the *Lectures*—in which self-knowledge, the strengthening of the *self*, and ceaseless action remain the central themes.

Keywords: Gulshan-i-Raz Jadid, Shaykh Mahmud Shabistari, Wahdat al-Wujud, Fana fi Allah, Khudi, Qur'an and Sunnah, Fitnah-i-Farang, Intellectual and spiritual revival

مثنوی گلشن راز جدید، علامہ اقبال کی فارسی شاعری کا ایک شاہکار ہے جو ان کے مجموعہ کلام زبور عجم میں شامل ہے۔ یہ مثنوی دراصل سات صدیوں قبل شیخ محمود شبستری کی شہرۂ آفاق تصنیف گلشن راز کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اقبال نے شبستری کے بیشتر سوالات کو اختیار کرتے ہوئے ان کے جوابات اپنے عہد کے فکری و تہذیبی حالات اور قرآن و سنت کی روشنی میں دیے۔ جہاں شبستری نے وحدت الوجود کے فلسفے میں فنا فی اللہ کو انسانی کمال سمجھا، وہیں اقبال نے اثباتِ خودی اور اس کی تکمیل کو زندگی کی معراج قرار دیا۔ اس مثنوی کی تخلیق کا پس منظر اقبال کے نزدیک امتِ مسلمہ کی فکری و روحانی زوال کی تشخیص اور اس کا علاج تھا۔ انہوں نے قدیم صوفیانہ اصطلاحات کو نئے دور کے تقاضوں کے مطابق از سرِ نو بیان کیا اور مغربی استعمار کے فتنۂ فرنگ کے مقابل ایک فکری و روحانی منشور پیش کیا۔ ۱۳۲۶شعار پر مشتمل یہ مثنوی، اقبال کی فکری ارتقاء کی اُس کڑی کا حصہ ہے جو اسرارِ خودی سے شروع ہو کر جاوید نامہ اور خطبات تک پہنچتی ہے، اور جس میں خود شناسی، خودی کا استحکام اور عملِ پیہم، مرکزی مضامین کے طور پر جلوہ گر ہیں۔ عبدالوہاب عزام نے لکھا ہے:

هو على طريقه الذي الشفه الشيخ محمود شبسترى اجابة الاسلة في التصوف ارسلها اليه بعض الصوفية ولهذا سمى اقبال منظومه گلش را از جديد وفيها سجب اقبال تسعه اسلة فيها دقائق فلسفة وصوفيه[1]

یہ حضرت علامہ اقبال کی مختصر فارسی مثنوی ہے لیکن اس کے اختصار و ایجاز میں دفترِ حکمت و معانی پوشیدہ ہیں یہ مثنوی اقبال کے چوتھے فارسی مجموعہ کلام زبور عجم کا حصہ ہے اس کتاب کا آغاز ۱۹۲۴ میں ہوا لیکن تکمیل و طباعت ۱۹۲۷ء میں عمل میں آئی۔ زبور عجم کا پہلا مجوزہ نام زبور جدید تھا۔ Songs of a modern David[۲الف] مگر بعد میں جب گلشن راز جدید اور بندگی نامہ نام کی مثنویاں اس کتاب میں شامل کر دی گئیں تو یہ موجودہ نام زبور عجم سے موسوم کی گئی۔ گلشن راز جدید محمود شبستری کی مثنوی کاشن راز کے جواب میں لکھی گئی اس لئے علامہ اقبال نے اپنی دیگر مثنویات کے برعکس گلشن راز جدید کی بھر بھی گلشن راز قدیم والی ہی رکھی ہے اور اسلوب تحریر بھی وہی ہے اور اس میں سوال بھی تقریباً وہی ہیں۔ اقبال نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی واردات قلبی اور کشف و شہود ہے۔ گلشن راز جدید کا موضوع تصوف ہے اور یہ شاعری کے بہترین شاہکاروں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ مجموعی طور پر ارفع طرز کلام کا نمونہ ہے۔ اس میں طبع کی روانی اور اسلوب کی طرحداری پہلے کے مماثل فارسی کام سے بدرجہ بہتر اور

بلند تر ہے۔ گلشن راز جدید میں اقبال نے اعلان کئے بغیر بے غیر محسوس انداز میں علامہ شبستری کے فراری تصوف کا رد کامل کیا ہے۔[۲ب]

اس مثنوی کا موضوع بہت مشکل مسائل پر مبنی ہے۔

پس منظر:

گلشن راز جدید کی تمہید میں علامہ خود بیان فرماتے ہیں کہ انہوں نے یہ نظم علامہ محمد شبستری کی مثنوی گلشن راز کے جواب میں لکھی ہے۔ اس دانائے تبریز کی آنکھوں کے سامنے وہ قیامتیں برپا ہوئیں جو چنگیز خاں کی تاخت و تاراج کا نتیجہ تھیں۔ فرماتے ہیں:

بطرز دیگر از مقصود گفتم
جواب نامۂ محمود گفتم
گذشت از پیش آں دانائے تبریز
قیامت ہا کہ رست از کشت چنگیز[۳]

علامہ نجم الدین محمود شبستری نے ۷۱۷ھ میں امیر سید حسینی ہروی[۴] کے منظوم سوالات متعلقہ تصوف اور وحدت الوجود کی تعلیمات کے جواب میں گلشن یا گلشن راز نامی مثنوی لکھی تھی۔[۵] امیر ہروی خراسان کے ایک بزرگ تھے اور خراسان کے سربرآوردہ مشائخ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ انہوں نے ایک قاصد کے ہاتھ پندرہ سوالات لکھ کر بھیجے اس وقت شبستری کے پاس شہر کے اکابرین موجود تھے انہوں نے فی البدیہ اور منظوم سوالات کے جواب منظوم بیان کرنا شروع کر دیئے۔ حالانکہ اس سے پہلے شبستری کو شاعری کا کوئی تجربہ نہ تھا۔[۶]

اس وقت شبستری نے مختصر جوابات دیئے تھے جو بعد میں انہوں نے طویل کتاب کی مشکل ہیں پھیلا دیے جو ۱۰۰۸ اشعار پر مشتمل ہیں، محمد شبستری کے زمانے سے لے کر آج تک اس موضوع پر اس سے بہتر تصنیف نظر نہیں آئی۔ گلشن راز کے ۱۰۰۰ اشعار ہیں اور دنیا کی کئی زبانوں میں اس کے تراجم ہو چکے ہیں۔

علامہ نے گلشن راز جدید کی تصنیف کی ضرورت اس لئے محسوس کی کہ وہ تصوف کی قدیم اصطلاحات کو اس زمانے کے مزاج کے مطابق نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے شبستری کی باتوں کو بہ طرز دیگر ادا کیا ہے۔

چونکہ علامہ اس امر کے قائل ہیں کہ اسلامی تصوف نے خودی کے کئی نئے باب کھولے ہیں اور خودی کا نظریہ اسلامی حکماء اور صوفیا سے ماخوذ ہے لیکن ان کے خیال میں تصوف کی مخصوص اصطلاحات

جو کہ فرسودہ مابعد الطبیعیات نے تشکیل دی ہیں ایک نئے دماغ پر موت کا سا اثر ڈالتے ہیں اسی کے پیش نظر انہوں نے بطرز دیگر از مقصود مفتم کا دعوی کیا ہے اور اس پر عمل بھی کیا ہے فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> محمود شبستری کی گلشن راز میں خودی کی فنا کی تعلیم دی گئی ہے جب کہ اقبال خودی کا درس دیتا ہے اور اس کی پختگی کو حیات جاودانی کا وسیلہ ظاہر کرتا ہے۔[۷]

دور حاضر کے ایک اور محقق نے لکھا ہے:

> علامہ نے گلشن راز کے مصنف علامہ شبستری کے فراری تصوف کا رد کامل کیا ہے۔[۸]

شبستری نے انسانی ذات کی کامیابی کو فنا میں مضمر قرار دیا ہے جب کہ اقبال نے خودی کے اثبات پر زور دیا ہے اور یہی اس مثنوی کی تصنیف کا پس منظر اور سب تالیف ہے۔ علامہ نے تقریباً سات سو سال کے بعد گلشن راز کا جواب اس بحر میں گلشن راز جدید کے نام سے دیا ہے البتہ اقبال نے پندرہ میں سے صرف گیارہ سوالوں کو جوب کے لئے منتخب کیا اور بعض جگہ دو سوالات کو یکجا کر کے ایک بنا دیا ہے اس طرح سوالات کی تعداد ۹ عدد رہ گئی ہے۔

سبب تالیف :

گلشن راز کا سبب تالیف اقبال نے یہ بیان کیا ہے کہ اہل مشرق کے دلوں سے وہ سوز جاتا رہا جو ان کی خصوصیت تھی وہ بے جان تصویر کی طرح ہو گئے ہیں نہ ان کے دل میں کوئی مدعا رہانہ آرزو، ان کا ساز بے آواز ہو گیا ہے۔ محمود شبستری نے ایک فتنہ چنگیز کا سامنا کیا تھا اور میں نے دوسری قسم کے فتنہ چنگیز کا مشاہدہ کیا ہے۔ فتنہ چنگیز میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ امصار و عمارات، تہذیب و اقدار کی تباہی ہوئی لیکن فتنہ فرنگ نے یہ سب کچھ کرنے کے ساتھ مسلمانوں کے دین و مذہب کو بھی مٹا ڈالنے کی کوشش کی۔ ان کے اسلاف کے کارناموں کو اس انداز سے پیش کیا کہ نئی نسل ان کی تابناکیوں سے بہرہ اندوز ہونے کی بجائے ان سے منحرف ہو گئی۔ فرماتے ہیں:

ز جان خاور آن سوز کہن رفت
دمش وا ماند و جان او ز تن رفت
چو تصویرے کہ بے تارِ نفس زیست
نمی داند کہ ذوق زندگی چیست
نگاہم انقلابے دیگرے دید

طلوع آفتابے دیگرے دید[9]

اقبال نے خود کہا ہے کہ محمود شبستری کے بعد کوئی شخص ایسا نہ آیا تھا جس نے ملت کے جسد مردہ میں زندگی اور ہمت و حرارت کی آگہی اور تدبیر کی چنگاری ڈالتا لیکن میں نے ایک نیا انقلاب اور نیا سورج طلوع ہوتے دیکھ لیا سو معنی کے چہرے سے نقاب اٹھا رہا ہوں اور اسے محض شاعری نہ سمجھیں، میں عام شاعروں کی طرح افسانہ طرازی نہیں کر رہا جگہ گلشن از جدید وہ نسخہ ہے جو مسلمانوں کے ملی امراض کے علاج کی خاطر تجویز کیا گیا ہے۔

کشودم از رخ معنی نقابے
بدست ذرہ دادم آفتابے
نہ بینی خیر ازاں مرد فرو دست
کہ بر من تہمت شعر و سخن بست[10]

محمود شبستری نظریہ وحدت الوجود کے مبلغ تھے جب کہ اقبال نے کاشن راز کے جواب میں گلش رانہ جدید لکھتے ہوئے اپنے مخصوص نقطہ نظر کو واضح کیا ہے۔ اس سلسلے میں این میری شمل لکھتی ہیں:

اقبال نے گلشن راز جدید میں مسائل تصوف کا جواب اپنے فلسفے کی روشنی میں دیا ہے"

مسلمانوں میں ایقان کی نئی روح پھونکنے کے لئے ضروری تھا کہ مسلمانوں کو ان کی حقیقت حیثیت سے آگاہ کیا جائے اقبال کو گلشن راز جدید تصنیف کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ گلشن راز میں ذات وصفات الہیہ اور حیات و کائنات کے متعلق جو نظریات ہیں ان میں سے اکثر اقبال کے نزدیک روح اسلام کے منافی ہیں اور ان میں غیر اسلامی تصوف و فلاسفہ کو اسلام کے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسری طرف فتنہ فرنگ نے مسلمانوں کے دین و ایمان بنقل و دانش یقین واعتماد، ہر چیز کو سلب کر دیا اور تاریخ کی اس ہولناک ٹریجڈی نے اقبال کو مجبور کیا کہ وہ ایک نئی گلشن راز تصنیف کریں۔[12]

خلیفہ عبد الحکیم کے مطابق:

اقبال نے ضروری سمجھا کہ جن سوالوں کے جواب محمود نے اپنے زاویہ نگاہ سے دینے ہیں انہی سوالوں کے جواب اب اس بصیرت سے دیئے جائیں جو اقبال کو قرآن حکیم اور حیات نبوی سے حاصل ہوئی۔ گلشن راز جدید میں علم اور عشق اور مقصود حیات کو ایک نئے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔[13]

امراض ملت کا اندازہ کرتے ہوئے حکیم الامت نے علاج کی غرض سے یہ نسخہ تجویز کیا جو گلشن راز جدید کی صورت میں ہمارے سامنے آیا اور چونکہ یہ مثنوی کاشن ان کی بنیاد اور اسلوب پر تحریر کی گئی اس لئے اس کا نام گلشن راز جدید تجویز کیا گیا۔"[۱۴]

گلشن راز جدید کے اشعار کی تعداد ۳۲۶ عدد ہے۔ گویا ان کے جوابات کی ضخامت شیخ محمود کے جوابات سے تقریبا نصف ہے۔ اس کتاب میں بھی اقبال کا ہدف وہی ہے جس کا آغاز انہوں نے اسرار خودی سے کیا تھا اس لحاظ سے گلشن راز جدید اسرار خودی ہی کا تتمہ و تکملہ ہے۔

فکر اقبال کے مراحل: (اسرار خودی سے گلشن راز جدید تک اور گلشن راز جدید سے خطبات تک)

گلشن راز جدید کی تصنیف علامہ اقبال کے سراپا تفکر دور سے متعلق ہے اسی دور میں انھوں نے اپنے شہرہ آفاق انگریزی خطبات تیار کئے پھر اسی دور میں جاوید نامہ شائع ہوا۔

۱۹۳۲ء میں جس کا ہیولی تو سالہا سال سے تیار ہو تا رہا مگر اس نے شعر و نغمہ کی صورت گلشن راز جدید کی تصنیف کے بعد اختیار کی۔ جیسا کہ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے کہا کہ "ان تین کتابوں میں کئی فلسفیانہ و متکلمانہ اور صوفیانہ مباحث ایک دوسرے کی توضیح و تفسیر کرتے نظر آتے ہیں۔" لیکن مذکورہ تین کتابوں میں خطبات اور جاوید نامہ کے مطالب مبسوط تر ہیں جب کہ گلشن راز جدید بالعموم جس موجز ہے۔[۱۵]

شبستری نے چنگیزی تباہ کاریوں کے زمانے میں اور اقبال نے فرنگیوں کے عقلی اور سیاسی استعمار کے دور میں گلشن راز جدید لا ید لکھی اس مثنوی کا سرنامہ اقبال نے دو شعروں کو بنایا ہے اور اپنا خودی آموز پیغام واضح کر دیا ہے۔

اس لحاظ سے گلشن راز جدید اس دور کی پیداوار ہے جو اسرار خودی سے شروع ہوا اور پس چہ باید کرد اے اقوام شرق کی تصنیف بلکہ علامہ کی زیست کے خاتمے کے ساتھ ہی اختتام پذیر ہوا۔

جگن ناتھ آزاد گلشن راز جدید کے فلسفیانہ پہلو پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں" ۱۹۲۰ء کے بعد اقبال نے جب یہ جانا کہ شیخ اکبر کی اور شنکر اچاریہ کی تعلیمات وحدۃ الوجود کی بنیاد ایک نہیں بلکہ شیخ اکبر نے قرآن و حدیث ہی کو اپنے نظام فکر کا ماخذ بنایا ہے تو انہوں نے شیخ اکبر کے نظریے کی شدید مخالفت ترک کر دی اور اس سلسلے میں اپنے نظریات و خیالات کی وضاحت کے لئے انہیں یہ ایک بہت عمدہ ذریعہ نظر آیا کہ ان سوالات کا جواب نظریہ وحدت الوجود کی روشنی میں دیں۔"[۱۶]

گلشن راز جدید کے بعد یہی عقیدہ مابعد کی تصانیف جاوید نامہ، بال جبریل، ضرب کلیم، مسافر، پس چہ باید کرد اور ارمغان حجاز میں بھی نظر آتا ہے حتیٰ کہ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ فکر اقبال کی پختہ ترین شکل ہے لیکن پختگی کے اس راستے ہیں جو چھوٹے چھوٹے مراحل فکر آتے رہے وہ مختصر ترالفاظ میں یہ ہیں۔

فلسفہ عجم کا دور، اسرار و رموز، پیام مشرق کا دور، زبور عجم کا دور جاوید نامہ تک، خطبات اور ارمغان حجاز کا دور۔

فکر اقبال کے مراحل کو اگر مختصر دیکھنا چاہیں تو ان ادوار کو کچھ اس طرح مختصر ترین کیا جا سکتا ہے۔

اول گلشن راز جدید، دوم جاوید نامہ، سوم خطبات۔

خودشناسی اور استحکام خودی ان سب میں قدر مشترک ہے، ہے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تضادات کے باوجود ان تمام ادوار میں فکر اقبال کا حقیقی اور سنجیدہ موضوع یہی رہا ہے۔

البتہ گلشن راز میں صوفیانہ تمثیلات واستعارات کے پردے ہیں اور جاوید نامہ میں شعری اسالیب سے زیادہ حقائق کی زبان میں یہی موضوع بیان کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں :

گلشن راز میں شبستری کے سوالوں کا جواب دیا جانا تھا سو اقبال کو ان کے دائرے میں مقید ہو کر اپنا جواب اس انداز سے دینا پڑا کہ شبستری کی ہر قابل تردید بات کا جواب آجائے۔ جب کہ جاوید نامہ کے مکالمات آزاد ہیں اس لئے ان کا رابطہ اسرار و رموز سے نسبتاً زیادہ محکم نظر آتا ہے۔ [١٧]

جب کہ خطبات فکر اقبال کی پختہ ترین منزل ہے جس میں اس مضمون کو بہترین فلسفیانہ نقطہ نظر سے بیان کیا گیا ہے۔

مثنوی گلشن راز جدید کے مضامین :

گلشن راز جدید کا موضوع کائنات و فطرت ہے اس میں زندگی اور خودی کے استحکام اور بعض دوسرے مسائل کے متعلق سوالات و جوابات کی صورت میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ محمود شبستری کے زمانے میں فلسفے تصوف اور علم الکلام کے مسائل علماء کے لئے میدان مناظرہ بن گئے تھے۔ گلشن راز میں ذات وصفات الہیہ اور حیات و کائنات سے متعلق فلسفیانہ انداز میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اقبال نے بھی انہیں مسائل پر اظہار خیال کیا ہے لیکن اپنے مخصوص نظریات کے مطابق انہوں نے غیر اسلامی تصوف اور فلسفے کی بجائے مسائل کو قرآن وحدیث کی روشنی میں پرکھا ہے اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ اقبال

نے ازراہ عقیدت گلشن راز کے جواب میں کتاب تصنیف نہیں کی۔ اگر ایسا ہوتا تو اقبال کو رومی سے زیادہ عقیدت اور کسی سے نہ وہ سب سے پہلے مثنوی معنوی کے اتباع میں کتاب لکھتے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال شیخ محمود شبستری کے عقیدت مند نہیں بلکہ بلحاظ فکر حریف تصور کیے جانے چاہیں۔[۱۸]

گلشن راز جدید کا سرنامہ یا ابتدائیہ:

اقبال نے اپنی تقریباً تمام تصانیف کے آغاز میں حسب حال اشعار رقم کیے ہیں اسرار خودی کے آغاز میں رومی کے تین شعر ہیں۔ رموز بے خودی کے آغاز میں بھی رومی کا ایک شعر بطور سرنامہ درج ہے۔ پس چہ باید کرد کے آغاز میں بھی چار اشعار بخوانندہ کتاب رقم کیے گئے ہیں۔ زبور عجم کے آغاز میں بھی بخوانندہ کتاب زبور کے عنوان سے تین اشعار رقم ہیں اس طرح گلشن راز جدید کے آغاز میں بھی اقبال نے سرنامہ کے طور پر یہ دو اشعار درج کیے ہیں:

بہ سواد دیدہ تو نظر آفریدہ ام من
بہ ضمیر تو جہانی دگر آفریدہ ام من
ہمہ خاوراں، بخوابے کہ نہاں ز چشم انجم
بہ سرود زندگانی سحر آفریدہ ام من[۱۹]

تمہید - گلشن راز جدید:

تمہید -- گلشن راز جدید میں اقبال کی خودشناسی قابل ملاحظہ ہے اور۔

کشودم از رخ معنی نقابی
بدست ذرہ دادم آفتابی[۲۰]

جیسے اشعار اس کی تصدیق کے لئے کافی ہیں۔

گلشن راز جدید کی تمہید میں اقبال نے اپنے موقف اور اپنے مقصد کی براہ راست توضیح کی ہے۔ مشرق کے عام انسان کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ تمہاری خاک بدن، جان سے محروم ہو چکی ہے چنانچہ میں نے اپنی جان تمہارے جسم میں ڈالی۔ میری آتش اندرون نے مجھے داغ داغ کر رکھا ہے اس چراغ سے اپنی دنیا روشن کرلو۔ آگے فرماتے ہیں:

مرا ذوق خودی چوں انگبین است
چہ گویم واردات من ہمین است

اگر ایں نامہ را جبریل خواند
چوں گرد آں نور ناب از خود فشاند[۲۱]

بنالد از مقام و منزل خویش
بہ یزداں گوید از حال دل خویش
مرا ناز و نیاز آدمی دہ
بجان من گداز آدمی دہ[۲۲]

اقبال نے یہاں اپنے فلسفہ خودی کو بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

خودی کے احساس و عرفان میں ایسی لذت ہے کہ اگر جبریل بھی اس سے آشنا ہو جائے تو وصال جاوداں کی بجائے فراق کو بر قرار رکھنے کی آرزو کرے نی آرزو کرے اور انسان کا سا سوز و گداز طلب کرے۔ اقبال کی نظر میں زندگی کا مقصد خدا کی ذات میں خود کو فنا کر دینا نہیں بلکہ خدا کو اپنی ذات میں جذب کر کے حیات ابدی حاصل کرنا ہے۔

شبستری نے فلسفہ، نفسیات، مابعد الطبیعات اور علم کلام کے بعض نہایت پیچیدہ نظری مسائل سے متعلق جن سوالات کے جوابات دیئے ہیں ان میں سے سبھی ادب کے قاری کے لئے خشک اور بے رس ہیں۔

اقبال نے پندرہ سوالات میں سے کل گیارہ سوالات منتخب کئے ہیں وہ درج ذیل ہیں: پہلا سوال تفکر کے بارے میں ہے:

تفکر کیا ہے ؟ وہ کیا چیز ہے کیا عالم جان ہے جو تفکر کہلاتا ہے۔ میں اپنی فکر سے غرق تحیر ہوں کہ تفکر یا عقل و حکمت کی ماہیت کیا ہے ؟ کس قسم کا تفکر انعام و اکرام کے قابل ہے اور کون سا انداز فکر بے راہ روی اور گناہ کہلاتا ہے۔

سوال :

کدامیں فکر مارا شرط راہ است؟
چرا گہ طاعت و گاہے گنہ است ؟[۲۳]

جواب: میں اقبال کہتے ہیں :

من او را ثابت و سیار دیدم
من او را نور دیدم نار دیدم

ہمیں دریا ہمیں چوب کلیم است
کہ از وے سینہ دریا دو نیم است
دو عالم می شود روزی شکارش
فتد اندر کمند تا بدارش
اگر ایں ہر دو عالم را بگیری
ہمہ آفاق میرد تو نہ میری[۲۴]

علم کامل سے دین کا مقصور تسخیر فطرت ہے اور یہی مقام دین حق کی منزل ہے۔ خودی کامل علم سے منزل کمال تک پہنچتی ہے اور یہی کامل خودی جہانگیر و جہانبان ہے۔

دوسرا سوال:

چہ بحر است این کہ علمش ساحل آمد؟
ز قعر او چہ گوہر حاصل آمد؟[۲۵]

یعنی وہ کون سا سمندر ہے جس کا ساحل علم ہے اور اس کی گہرائی سے کون سا گوہر حاصل ہوتا ہے؟ اس کے جواب میں اقبال نے بڑے گہرے سمندر میں غوطہ لگایا ہے۔ اسے آساں زبان میں بھی بیان کیا جائے تو اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ ہر قاری کے لیے قابل فہم ہو؟[۲۶]

پہلے ہی شعر میں فرماتے ہیں:

حیات پر نفس بحر روانے
شعور و آگہی او را کرانے[۲۷]

جواب کے پہلے ہی شعر میں دونوں باتوں کا تعین ہو جاتا ہے زندگی ہر دم مستعد اور کار فرما سمندر اور شعور و آگہی اس کا ساحل ہے۔ موج اچھلتی ہے تو تشنہ کام صحرا کو نم اور نگاہ طلب کو لذت کیف و کم سے آشنا کر دیتی ہے۔ مزید فرماتے ہیں:

شعورش با جہاں نزدیک تر کرد
جہان او را ز راز او خبر کرد
خودی او را بیک تار نگہ بست
زمین و آسمان و مہر و مہ بست
کمال ذات شے موجود بودن

برائے شاہدے مشہود بودن
چو آتش خویش را اندر جہان زن
شبیخون بر مکان و لا مکان زن[28]

مطلوب اس سوال کا جواب دیتے ہوئے آخر میں اقبال یہ تلقین کرتے ہیں کہ پرواز کی برق رفتاری مطلوب ہے تو جبریل امیں کے سے بال و پر پیدا کر۔ خودی صیاد ہے اور مہ و مہر اس کے نخچیر ہیں اس لئے جہاں میں اپنی آگ کو بھڑکا اور اس کو شعلہ زارہ بنادے مکاں کو اپنے پاؤں تلے روند ڈال کہ وہ تیرے منتظر ہیں۔

تیسرا سوال ہے:

وصال ممکن و واجب بہم چیست؟
حدیث قرب بُعد و بیش و کم چیست؟[29]

تیسرا سوال یہ ہے کہ وصال ممکن اور واجب کسی طرح ممکن ہے اور یہ قرب و بعد اور کم و بیش کی بحث کیا ہے؟

یہاں مابعد الطبیعیات کی دو اصطلاحات ممکن الوجود اور واجب الوجود کا ذکر کیا گیا ہے۔ امکان و وجوب کا مسئلہ فلسفہ اور علم الکلام کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ ہستی باری تعالیٰ کو ذات واجب الوجود کہتے ہیں۔ یعنی اس کا ہونا لازم ہے اور اس کو مانے بغیر عقل کو چارہ نہیں۔ وہ ہستی مطلق ہے واجب بھی ہے اور قدیم بھی اس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ حادث ہے یا ممکن ہے یعنی اس کا ہونا لازمی نہیں اس کی ہستی اور نیستی دونوں کا امکان ہے۔ جو کچھ وجود ہے وہ بھی ہستی واجب الوجود سے مستعار ہے۔ ماسوا یا حادث و ممکن کا ظہور بھی آخر ہستی مطلق اور واجب کی بدولت ہوتا ہے۔ خدا اپنی مخلوقات سے جو ممکنات پر مشتمل ہیں بالکل بے تعلق تو نہیں رہ سکتا لیکن یہ تعلق منطق عقل کے ادراک میں نہیں آسکتا۔ ہستی واجب و قدیم، حادث و ممکن سے قریب بھی ہے اور بعید بھی، یہاں وصل بھی ہے اور فراق[30] بھی از روئے منطق تو وصل اور فراق میں تضاد ہے لیکن از روئے حقیقت یہ کیفیت بیک وقت موجود ہے۔

یعنی " نحن اقرب الیہ من حبل الورید را"[31] کی کیفیت بھی ہے اور خالق و مخلوق میں ناقابل عبور خلیج بھی حائل ہے۔ رومی نے اسی کیفیت کو اپنی مثنوی میں یوں ظاہر کیا ہے:

اتصال بے تکیف بے قیاس
ہست رب الناس را با جان ناس[32]

اسلامی الہیات و تصوف میں یہ مسائل سب سے عمیق اور عالمانہ سطح پر ابن العربی نے اٹھائے لیکن اس سے بھی پہلے ۹۰۰ برس قبل مسیح سے ۴۰۰ برس قبل مسیح کے دوران یہ سوال بھارت کے رشیوں نے اٹھائے تھے محققین کا خیال ہے کہ کل ۱۰۸ اپنشد لکھے گئے تھے۔

ان اپنشدوں کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ معرفت الٰہی یا برہم گیان میں کسی قوم، کسی تہذیب کے مفکر اپنشد کے رشیوں کی سی عظیم الشان بلندی تک نہیں پہنچے۔ اپنشدوں نے یہ بات پیش کی کہ اصل اور مطلق حق باری تعالیٰ یا برہم ہے جو واجب الوجود ہے کہ مطلق ہے، وہ ہمہ (ست) وجود ہے۔ [۳۳]

چون وچند؟ چند کی دنیا تین پہلو رکھتی ہے۔ اس کے کیف و کم کے لئے عقل انسانی کمند ہے۔ ایک پہلو طوسی و اقلیدس کا جہان ہے عقل فرسا کے لئے بس یہی کافی ہے۔ اس جہان کا زمان و مکان سب اعتباری ہے۔ عالم ہست کا کنارہ اندر ہے باہر نہیں وہ بلندی ہے نہ پستی، نہ کمی ہے نہ بہتات عقل، ابد کا احاطہ نہیں کر سکتی وہ مغز کو دیکھ نہیں پاتی سو پوست پر فریفتہ ہے۔

فرماتے ہیں:

سہ پہلو ایں جہان چون و چند است
خرد کیف و کم او را کمند است
مجو مطلق درین دیر مکافات
کہ مطلق نیست جز نور السموات
تن و جاں را دو تا گفتن کلام است
تن و جاں را دو تا دیدن حرام است
بجان پوشیدہ رمز کائنات است
بدن حالے ز احوال حیات است [۳۴]

جسم یا جہان حقیقت مطلقہ کا خود اپنے چہرے پر ڈالا ہوا پردہ ہے۔ یہ پردہ ذوق حجاب نے نہیں بلکہ ذوقِ اظہار و انکشاف نے بنایا ہے۔

حقیقت روی خود را پردہ باف است
کہ اورا لذتی از انکشاف است [۳۵]

اقبال کے جواب کا لب لباب یہ ہوا کہ جسے ممکن کہتے ہیں وہ ذاتِ مطلق کے اظہار کی ایک کیفیت ہے۔ واجب اور ممکن دو متضاد الاصل وجود نہیں۔ ریاضیاتی عقل کے لئے یہ نا قابل حل مسئلہ ہو تو ہو عرفانی و وجدانی بصیرت کے لئے یہ کوئی لاینحل عقدہ نہیں۔

نفس و بدن کی دوئی کا فلسفہ مذہب و سیاست میں خلیج حائل کرنے کے باعث بنا اور تقلید فرنگ میں مسلمانوں نے اسلامی نظریہ حیات کی بجائے یہ روش اختیار کرلی کہ:

به تقلید فرنگ از خود رمیدند
میان ملک و دین ربطی نه دیدند[۳۶]

جسے تم کائنات سمجھتے ہو وہ ذات پاک کی سرگزشت کا ایک لمحہ اور ایک حال ہے اسے مستقل کائنات سمجھنا مردے کا پوسٹ مارٹم کرنا ہے اس لیے اقبال کہتے ہیں:

دریں حکمت دلم چیزے نہ دید است
برائے حکمت دیگر تپید است[۳۷]

مجھے تو جہان کے باطن میں ایک انقلاب انگیز اور احوال خیز حیات نظر آتی ہے کائنات مسلسل ارتقاپذیر و خلاق ہے:

من این گویم جهان در انقلاب است
درونش زنده و در پیچ و تاب است[۳۸]

وہ کہتے ہیں طوسی و رازی ارسطو اور بیکن کو تھوڑے عرصے کے لیے ہم سفر ضرور بناؤ لیکن انہیں وہیں چھوڑ کر اس حقیقت تک پہنچنے کے لئے آگے بڑھ جاؤ جو لافانی و لامکانی ہے۔

مقام تو برون از روزگار است
طلب کن آں یمین کو بے یسار است[۳۹]

چوتھا سوال ہے:

اگر معروف و عارف ذات پاک است
چه سودا در سر ایں مشت خاک است[۴۰]

قدیم و محدث کا سوال در حقیقت واجب و ممکن کے مابین ربط کے سوال کا ایک پہلو ہے لیکن اس سوال کا جواب اقبال اپنے فلسفہ خودی کی روشنی میں دیتے ہیں:

سوال یہ ہے کہ خدا اور عالم ایک دوسرے سے جدا کیوں ہوئے؟ خدا کو کیا ضرورت تھی کہ ماسوا کو بھی اپنے مقابل لا کھڑا کرے۔ بالفاظ دیگر سوال یہ ہے کہ تکوین عالم کی وجہ کیا ہے؟ اگر ناظر و منظور، عارف و معروف اور شاہد و مشہور ایک ہی ذات پاک ہے تو انسان کے سر میں یہ سودا کہاں سے سما گیا جو ہمہ وقت اسے مضطرب رکھتا ہے۔

اقبال جواب دیتے ہیں:

قدیم و محدث ما از شمار است
شمار ما طلسم روزگار است
ازو خود را بریدن فطرت ماست
تپیدن نا رسیدن فطرت ماست
نہ مارا در فراق او عیارے
نہ او را بے وصال ما قرارے [۴۱]

فراق عشق کی فطرت میں داخل ہے اور یہی وجہ آفرینش ہے۔ خدا نے جامد و بے جان اشیا پیدا نہیں کیں بلکہ وہ خود نفس ہے اور اس سے نفوس ہی صادر ہوتے ہیں "سبح للہ مافی السموات والارض" سے مراد یہی ہے۔ تسبیح نفوس ہی کا فعل ہو سکتی ہے جامد اشیا کا نہیں۔

من و او چیست اسرار الٰہی است
من او بر دوام ما گواہی است [۴۲]

خدا اور بندے کے درمیان فراق اور وصال کی حالتیں یکے بعد دیگرے آتی رہتی ہیں

گہے خود را ز ما بیگانہ سازد
گہے مارا چو سازی می نواز [۴۳]

یہی وجہ ہے کہ انسان بے قرار رہتا ہے۔ یہی سودا انسان کے دل میں سمایا ہوا ہے جو اصل میں سرچشمہ حیات ہے:

چہ سودا در سر این مشت خاک است
ازیں سودا درونش تابناک است [۴۴]

خدا کی محبت ہی انسان کے لیے ذریعہ ارتقاہے اور خودی کی ماہیت یہ ہے کہ وہ اپنی عینیت کو قائم رکھنے کی کوشش کرے اس لیے اقبال کہتے ہیں :

خودی اندر خودی گنجد محال است
خودی را عین خود بودن کمال است[۴۵]

پانچواں سوال:

کہ من باشم مرا از من خبر کن!
چہ معنی دارد اندر خود سفر کن[۴۶]

یہ سوال خودی کی مزید توضیح کے لئے کیا گیا ہے۔ انا کیا ہے اور خود اپنی ذات میں سفر کرنے کیا معنی ہیں۔ جواب میں اقبال کہتے ہیں کہ خودی حفظ بقائے کائنات کی ضامن ہے۔ خودی -ازلی حقیقت سے اور حیات اس کا پرتو ذات ہے۔

خودی تعویذ حفظ کائنات است
نخستین پر تو دانش حیات است
نہ او را بے نمود ما کشودے
نہ ما را بے کشود او نمودے[۴۷]

پیکر خاک تو خودی کا حجاب بن جاتا ہے لیکن اسی کے اندر سے آفتاب طلوع ہوتا ہے۔ خودی کی ماہیت و حقیقت بیان کرنے کے بعد اقبال فرماتے ہیں کہ:

چہ معنی دارد اندر خود سفر کن" کا جواب تو میں ایک انداز سے دے چکا ہوں:

سفر در خویش زادن بے اب و مام
ثریا را گرفتن از لب بام
جدا از غیر و ہم وابستہ غیر
گم اندر خویش و ہم پیوستہ غیر
خیال اندر کف خاکے چسان است
کہ سیرش بے مکان و بی زمان است
مشو غافل کہ تو او را امینی!
چہ نادانی کہ سوئے خود نہ بینی[۴۸]

خودی جب لامکانی ولازمانی حالت سے شہود کی طرف واپس آتی ہے تو عالم مکانی اس کی مٹھی میں ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ دانش کا نہیں بلکہ بینش کا ہے۔ خودی غیر خود سے وابستہ بھی ہے اور ماوری بھی، لامتناہی زمان و مکان کا عالم اس کے اندر سماجاتا ہے۔ خودی کی ترقی خرد سے عشق کی طرف ہوتی ہے۔ خودی صید بھی ہے اور صیاد بھی اور باطن کا چراغ بھی اس کے نور میں مسلسل اضافہ ہی انسان کا فرض ہے۔

چھٹا سوال:

چہ جزو است آنکہ او از کل فزون است
طریق جستن آن جزو چون است[۴۹]

یہ سوال بھی خودی کی ماہیت کی بابت ہے۔ پہلے جوابات میں خودی کی حقیقت بہت کچھ بیان ہو چکی ہے۔ انسان کی خودی کل موجودات کا ایک جزو معلوم ہوتی ہے لیکن اس پر جزو کل کا اطلاق نہیں ہوتا۔ لامتناہی زمان و مکان کا عالم اس کے اندر سماجاتا ہے:

چہ گویم از چگون و بی چگونش
بروں مجبور و مختار اندرونش
چنین فرمودہ سلطان بدر است
کہ ایمان در میان جبر و قدر است[۵۰]

خدا نے خودی کو خود آفریں پیدا کیا ہے خدا خلاق بھی ہے اور مختار بھی اور یہ صفت خدا نے انسانی خودی میں بھی رکھ دی ہے:

چون از خود گرد مجبوری فشاند
جہان خویش را چون ناقہ راند
ازاں مرگی کہ می آید چہ باک است
خودی چون پختہ شد از مرگ پاک است[۵۱]

آخر میں اقبال کہتے ہیں:

ز مرگ دیگرے لرزد دل من
دل من جان من آب و گل من
بدست خود گفت بر خود بریدن
بچشم خویش مرگ خویش دیدن[۵۲]

خودی کی موت عشق کے فقدان سے ہے اور اصل موت یہی ہے اسی موت سے ڈرنا چاہیے۔

ساتواں سوال:

مسافر چون بود اہرو کدام است
کرا گویم کہ او مرد تمام است [۵۳]

سوال یہ ہے کہ مسافر اور رہرو کسے کہتے ہیں؛ اور سفر کے کیا معنی ہیں؟ انسان کامل کی نشانی کیا ہے؟ اقبال نے جابجا زندگی کو ایک لامتناہی سفر اور مرحلہ شوق کہا ہے۔ اس سوال میں اسی سفر کے بارے میں سوال ہے۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ کوئی خارجی عالم کی مسافت طے کرنا نہیں۔ یہ سفر خودی کا باطنی ارتقائی سفر ہے اس میں انسان خود ہی مسافر ہے، خود ہی راستہ ہے اور خود ہی منزل ہے یہ از خود تا بخود سفر ہے۔ یہ خودی کی مسلسل ترقی یافتہ صورتوں تک پہنچنے کی کوشش کا نام ہے:

اگر چشمے کشائی بر دل خویش
درون سینہ بینی منزل خویش
سفر اندر حضر کردن چنین است
سفر از خود بخود کردن همین است
بپایاں تارسیدن زندگانی است
سفر ما را حیات جاودانی است [۵۴]

اقبال کہتے ہیں کہ خودی اپنی ترقی اور بصیرت میں اضافہ کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی تب و تاب محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ نہ محنت کو فنا ہے نہ یقین و دید کی کوئی انتہا ہے۔ ہے۔ خُدا کے حضور بھی اپنی خودی کو مستحکم رکھ تاکہ تجھ میں دید کی قوت پیدا ہو جائے۔

چنان با ذات حق خلوت گزینی
ترا او بیند و او را تو بینی
کسی کو دید عالم را امام است
من و تو ناتمامیم او تمام است [۵۵]

آگے اقبال اپنے مخصوص انداز میں فرنگ سے خبردار کرتے ہیں فرنگی جمہوریت پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور مرد کامل سے راہنمائی پانے کی تلقین کرتے ہیں:

ز من دہ اہل مغرب را پیامے
کہ جمہور است تیغ بے نیامے
نہ ماند در غلاف او زمانے
برد جان خود و جان جہانے[۵۶]

اقبال بھی رومی کی طرح مرد تمام کی تلاش میں شرق و غرب میں نگاہیں دوڑا رہے ہیں لیکن انہیں ایسا انسان کامل کہیں نظر نہیں آتا لیکن وہ کہتے ہیں کہ مرد کامل کو تلاش کرو اگر مل جائے تو اس کا دامن نہ چھوڑنا۔

آٹھواں سوال:

کدامی نکتہ را نطق است "انا الحق"
چہ گوئی ہرزہ بود آن رمز مطلق[۵۷]

آٹھواں سوال مسئلہ وحدت الوجود یعنی منصور کے کلمہ انا الحق کے متعلق ہے اور یہ پوچھا گیا ہے کہ یہ کلمہ کفر ہے یا معراج عرفان انا الحق تمام تصوف کا محور ہے۔ علماً ظاہر نے اس کو سولی پر چڑھا دیا تھا لیکن صوفی اس کو عارف باللہ اور امام سمجھتے ہیں اور تنگ نظر فقہا کو ایک معصوم کے قتل کا مجرم قرار دیتے ہیں۔

محمود شبستری نے بھی گلشن راز میں منصور کی بہت حمایت کی ہے۔ انا الحق کا عقیدہ ہند و تصوف کا بھی لب لباب ہے۔ اقبال نے جو نظریہ خودی پیش کیا اس میں بھی جابجا خودی اور خدا میں امتیاز کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

مرزا غالب بھی عقلی طور پر وحدت الوجود کے قائل تھے اس کی مثالیں ان کے اُردو اور فارسی کلام میں بکثرت ہیں۔ یہاں اقبال اس سوال کا جواب یہ دیتے ہیں کہ:

من از رمز "انا الحق" باز گویم
و گر با ہند و ایران راز گویم[۵۸]

اقبال کہتے ہیں: حلقہ دیر میں ایک مع نے کہا کہ دنیا ایک سوئے ہوئے خدا کا خواب ہے۔ اقبال اپنے کلام کا آغاز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہماری ذات کا فروغ بھی قیاس ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ:

توان گفتن ہمہ نیرنگ ہوش است
فریب پردہ ہای چشم و گوش است
خودی از کائنات رنگ و بو نیست
حواس ما میان ما و او نیست[59]

اقبال اس سلسلے میں خود کہتے ہیں:

ذاتی طور پر میں ابدیت کو تحرک کے طور پر سمجھتا ہوں نہ کہ لایزال قسم کی کوئی چیز۔ انسان زندگی کا امید وار ہے جو خودی کے تناؤ کو قائم رکھنے کے لیے انتھک تگ ودو کرتی ہے۔[60]

دلیل کے طور پر اقبال کہتے ہیں کہ اگر تو یہ کہتا ہے کہ میں محض وہم و گمان کا افسون ہوں تو پھر مجھے یہ بتا کہ دارائے گمان کون ہے؟

بگو با ما کہ دارائے گماں کیست؟
یکی در خود نگر آں بے نشاں کیست ؟
خودی چوں بختہ گردد لازوال است
فراق عاشقاں عین وصال است[61]

اقبال کے نظریہ حیات میں خدا بھی حق ہے اور انسانی خودی بھی۔ کیونکہ انسانی خودی خدا کی حیات ابدی سے سرزد ہوئی ہے۔ اس لیے اگر کائنات کے وجود حقیقی پر شک ہو سکتا ہے تو شک کرنے والا نفس فی الواقع موجود ہو گا تو شک کر سکے گا۔ اس لئے شک کرنے والا موہوم نہیں ہے۔ چونکہ ہماری دانش قیاسی ہے اور قیاس کا مدار حواس پر ہے لیکن اپنے نفس کے وجود کا انکار کرنا ممکن نہیں جیسے ڈیکارٹ کہتے ہیں کہ میرا سوچنا اور موجودات پر شک کرنا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ صاحب فکر نفس موجود ہے۔ خدا کی خودی تو سرمدی دوام کی حامل ہے لیکن انسان کی خودی کو لازوال کرنے کے لیے عمل اور عشق سے پائیدار کرنا پڑتا ہے۔

اقبال جہان کو فانی اور خودی کو باقی قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں :

وجود کوھسار و دشت و در ہیچ
جہان فانی، خودی باقی دگر ہیچ[62]

اقبال شنکر اچاریہ اور منصور حلاج کے انا الحق کو بر طرف کر کے عرفان خودی کے ذریعے خدا کا عرفان حاصل کرنے پر زور دیتے ہیں:

بخود گم بہر تحقیق خودی شو!
انا الحق گوے و صدیق خودی شو[۶۳]

نواں سوال

کہ شد بر سر وحدت واقف آخر؟
شناسائی چہ آمد عارف آخر؟[۶۴]

آخری سوال یہ ہے کہ وحدت کا راز دار اور حقیقت کا عارف کسے سمجھا جائے؟ چونکہ ان تمام سوالوں کے جوابات اقبال نے اپنے انداز فکر کے تحت دیتے ہیں اس لئے فرماتے ہیں:

تہ گردوں مقام دل پذیر است
ولیکن مہر و ماہش زود میر است
گلاں را در کمیں باد خزاں است
متاع کارواں از بیم جان است[۶۵]

اقبال دنیا کی ناپائیداری اور مہر و ماہ کی زود میری سے بہت نالاں ہیں۔ کہتے ہیں خزاں پھولوں کی گھات میں رہتی ہے، نوا چنگ کے اندر ہی دم توڑ دیتی ہے شام کے کاندھے پر سورج کی لاش ہے، ستاروں کو کفن چاندنی پہنا دیتی ہے اس لیے آخر میں کہتے ہیں:

مپرس از من ز عالمگیری مرگ
من و تو از نفس زنجیری مرگ[۶۶]

اس کے بعد ایک غزل آتی ہے اور غزل کے بعد آخری کلام مثنوی کو اتمام تک پہنچاتا ہے

فدا را بادۂ ہر جام کردند!
چہ بے دردانہ او را عام کردند[۶۷]

ہر شے فنا پذیر ہے سوائے چراغ خودی کے جو کسی صرصر فنا سے نہیں بجھتا۔ خدا چونکہ خود زندہ ہے اس لیے تنہائی پسند نہیں۔ الست بر بکم خود خدا کے ذوق سے سرزد ہوا۔ اپنی خودی کو لازوال بنا تا کہ خُدا کی بزم آرائی باقی رہے۔

مثال دانہ می کارم خودی را
برائے او نگہدارم خودی را[۶۸]

گلشن راز جدید میں اقبال نے اپنے فلسفہ خودی و بے خودی اور ان کے بعض دیگر لوازمات مثلاً عقل و حکمت، عرفان، وجدان کی مزید عالمانہ تشریح کی ہے نیز اس مسلک تصوف کا معقل و مدلل رد پیش کیا ہے۔ جو حرکت و عمل کے بجائے رہبانیت و مجہولیت کی دعوت دیتا ہے۔ گلشن راز جدید میں تمام سوالوں کے جواب اقبال نے اپنے انداز فکر کے تحت خوبصورت شاعرانہ اسلوب میں دیے ہیں۔

مثنوی گلشن راز جدید میں اسرار خودی کی اول تا آخر خودی کا بیان ہے اسی لیے آخری سوال کے جواب میں غزل کے مقطع میں بھی یہی مضمون ادا کیا گیا۔

خودی در سینہ چاکے نگہدار!
ازیں کوکب چراغ شام کردند[۶۹]

تو ظاہر ہوا کہ اس جہان فانی میں موت جس کی حقیقت مبرم ہے، صرف ایک چیز ہے خودی جو پرورش کرنے کی ہے کہ وہ کامل ہو جائے تو فنا کی زد سے بالا ہو کر آدمی کو موت سے نجات دلا سکتی ہے، وہ چیز خودی ہے سوال وجواب تمام ہونے کے بعد خاتمہ کلام کے طور پر چھ اشعار رقم کیے گئے ہیں جو فرد و ملت دونوں سے مخاطب ہیں:

تو شمشیری ز کام خود بروں آ
بروں آ از نیام خود بروں آ
شب خود روشن از نور یقین کن
ید بیضا بروں از آستین کن
شراری جستہ گیر از درونم
کہ من مانند رومی گرم خونم[۷۰]

خواہشوں اور غیبتوں کی سطح سے اوپر اٹھ تو تلوار ہے۔ بدن کی نیام سے باہر نکل، حجابات اٹھا دے، علم اشیا اور علم خیر کے مقام وصال پر پہنچ کر قدیم زمانے کے معجزے از سر نو ممکن ہو جائیں۔ میرے اندر جو چنگاریاں نکل رہی ہیں ان سے استفادہ کرو کہ میں رومی کی طرح گرم خون ہوں ورنہ پھر نئی تہذیب آگ مانگنی پڑے گی جس کی بدولت سے ظاہر کو دہکا لیتا ہے اور اندر سے مرجہ مرجاتا ہے۔ یہاں اقبال مادی سائنس اور تہذیب انسان ظارنو کے ظاہری glitter کو برا کہہ رہے ہیں۔

گلشن راز جدید مجموعی طور پر بہت ارفع و اعلیٰ کلام سے مزین ہے عجمی تصوف کی فراریت کے خلاف خودی کی طاقت کو حکمران عالم قرار دیتے ہوئے اپنی خودی کو مستحکم کرنے کی تلقین اس مثنوی کا مضمون خاص ہے۔ اقبال کے نزدیک تصوف (روایتی) ہلاک امتاں ہے اور کی مثنوی معنوی کے گوہر شب چراغ کے سامنے کانچ کے ٹکڑے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

حوالہ جات وحواشی

۱ محمد اقبال سیرت وفلسفہ وشعر از عبدالوہاب عزام الدکتور ص ۱۳۶، ص ۱۳۷

۲الف محمد عبداللہ قریشی، روح مکاتیب اقبال، (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۷ء) ص ۳۳۴ (خط بنام خاں محمد نیاز الدین خان)؛ رحم بخش شاہین، نیز اوراق گم گشتہ، (لاہور: اسلامک پبلیکشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، ۱۹۷۹ء) ص، ۱۱۸

۲ب حمید نسیم، علامہ اقبال ہمارے عظیم شاعر، (کراچی: فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، ۱۹۹۳ء)، ص ۲۴۸

۳ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال فارسی، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۹۰ء) ص ۵۳۷، ۵۳۸

۴ محمد ریاض، آفاق اقبال، (لاہور: گلوب پبلشرز، ۱۹۸۷ء)، ص ۱۳۹

۵ اعجاز الحق قدوسی، اقبال کے محبوب صوفیا، (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۲ء)، ص ۲۱۹

۶ محمد طفیل (مدیر)، نقوش اقبال نمر، (لاہور: ادارہ فروغ اردو، ستمبر ۱۹۷۷ء)، ص ۳۱۴

۷ فرمان فتح پوری، اقبال سب کے لیے، (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۷ء)، ص ۴۴۳

۸ حمید نسیم، علامہ اقبال ہمارے عظیم شاعر، ص ۲۴۸

۹ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال فارسی، ص ۵۳۷، ۵۳۸ (گلشن راز جدید)

۱۰ ایضاً، ص ۹۸، ۹۹

۱۱ ڈاکٹر محمد ریاض (مترجم)، شہپر جبریل، (لاہور: گلوب پبلشرز، ۱۹۸۵ء) ص ۷۲

۱۲ رئیس احمد جعفری، اقبال اپنے آئینے میں، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۶۶ء)، ص ۳۱۱

۱۳ عبدالحکیم خلیفہ، فکر اقبال، (لاہور: بزم اقبال، ۱۹۸۸ء) ص ۵۲۶

۱۴ احمد ندیم قاسمی (مدیر)، صحیفہ اقبال نمبر، شمارہ، جولائی تا اکتوبر ۱۹۷۷ء، ص ۱۲۶

۱۵ ڈاکٹر سید عبداللہ، متعلقات خطبات اقبال، (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۷ء) ص ۲۵۱، ۲۵۲

۱۶ جگن ناتھ آزاد، اقبال اور اس کا عہد، (لاہور: الادب، ۱۹۷۷ء) ص ۸۷

۱۷ ڈاکٹر سید عبداللہ، مقاصد اقبال، (لاہور: علمی کتب خانہ، ۱۹۸۱ء) ص ۱۸۴

۱۸ فرمان فتح پوری، اقبال سب کے لیے، ص ۴۴۲

۱۹ زبور عجم، ص ۲۰۲

۲۰ ایضاً ص ۲۰۴

۲۱ ایضاً ص ۲۰۵، ۲۰۶

۲۲ زبور عجم، ص ۲۰۶ (گلشن راز جدید)

۲۳ ایضاً ص ۲۰۷

۲۴ ایضاً ص ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹

۲۵ ایضاً، ص ۲۱۱

۲۶ عبدالحکیم خلیفہ، فکر اقبال، ص ۵۳۳

۲۷ زبور عجم، ص ۲۱۱

۲۸ ایضاً، ص ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴

۲۹ ایضاً ص ۲۱۵

۳۰ عبدالحکیم خلیفہ، فکر اقبال، ، ص ۵۳۶

۳۱ القرآن سورہ ق، آیت ۱۶

۳۲ مولانا جلال الدین رومی، مثنوی معنوی، (لکھنو: مطبع نولکشور، ۱۹۵۳ء) ص ۳۳۲

۳۳ حمید نسیم، علامہ اقبال ہمارے عظیم شاعر، ص ۲۳۵

۳۴ زبور عجم، ص ۲۱۶، ۲۱۵، ۲۱۷

۳۵ ایضاً، ص ۲۱

۳۶ ایضاً، ص ۲۱۷

۳۷ ایضاً، ص۲۱۸

۳۸ ایضاً، ص۲۱۸

۳۹ ایضاً، ص۲۱۸

۴۰ ایضاً، ص۲۱۹

۴۱ ایضاً، ص۲۱۹، ۲۲۰

۴۲ ایضاً، ص۲۲۰

۴۳ ایضاً، ص۲۲۰

۴۴ ایضاً، ص۲۲۱

۴۵ ایضاً، ص۲۲۲

۴۶ ایضاً، ص۲۲۳

۴۷ ایضاً، ص۲۲۳

۴۸ ایضاً، ص۲۲۰

۴۹ ایضاً، ص۲۲۷

۵۰ ایضاً، ص۲۲۸

۵۱ ایضاً، ص۲۲۸، ۲۳۰

۵۲ ایضاً، ص۲۳۰

۵۳ ایضاً، ص۲۳۱

۵۴ زبور عجم، ص۲۳۱ (گلشن راز جدید)

۵۵ ایضاً، ص۲۳۲

۵۶ ایضاً، ص۲۳۳، ۲۳۴

۵۷ ایضاً، ص۲۳۵

۵۸ ایضاً، ص۲۳۵

۵۹ ایضاً، ص۲۳۶

۶۰ سید نذیر نیازی، (مترجم)، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۵۸ء)، ص۱۸۴

۶۱ زبور عجم، ص۲۳۷

۶۲ ایضاً، ص۲۳۸

۶۳ ایضاً، ص۲۳۸

۶۴ ایضاً، ص۲۳۹

۶۵ ایضاً، ص۲۳۹

۶۶ ایضاً، ص۲۴۰

۶۷ ایضاً، ص۲۴۰

۶۸ ایضاً، ص۲۴۲

۶۹ ایضاً، ص۲۴۱

۷۰ ایضاً، ص۲۴۳